— پروفیسر کرم حیدری

اہلِ ایران اور فارسی زبان

کا

خطۂ پوٹھوہار کی زبان، تمدّن اور مذہب پہ اثر

دریائے جہلم اور دریائے سندھ کا درمیانی علاقہ جغرافیائی اصطلاح میں دوآبہ سندھ ساگر کہلاتا ہے۔ اس دوآبہ کا بالائی حصہ جو شمال میں مری اور ہزارہ کی پہاڑیوں اور جنوب میں سون سکیسر کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے، سطح مرتفع پوٹھوہار کہلاتا ہے۔ اس امر کی آج تک تحقیق نہیں ہو سکی کہ لفظ پوٹھوہار کی ابتدا کون سے زمانہ سے ہوئی اور اس لفظ کا مادّہ اور صحیح مفہوم کیا ہے اور سب سے پہلے اس خطے کے لیے یہ لفظ کب استعمال ہوا۔ کچھ مصنفین نے اس لفظ کی تشریح کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن یہ کوششیں محض دُور کی کوڑی لانے کے مترادف ہیں۔ بس اتنی بات مسلّم ہے کہ یہ لفظ عرصۂ دراز سے مستعمل ہے اور اس کا لفظی مفہوم شاید کچھ بھی نہیں۔

برِصغیر ہند و پاکستان زمانۂ قدیم سے باہر سے آنے والے لوگوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ یہ بیرونی لوگ عام طور پر حملہ آوروں کی صورت میں آتے رہے ہیں اور عربوں اور یورپی اقوام کو چھوڑ کر باقی تمام حملہ آور شمال مغربی دروں کے راستے اس برِصغیر میں وارد ہوتے رہے اور سب سے پہلے اُن کا ٹھکانا عام طور پر اسی خطہ میں ہوتا رہا ہے جسے ہم پوٹھوہار کہتے ہیں۔ سندھ کے پار کا علاقہ محض ایک گزرگاہ کا کام دیتا رہا۔ لیکن سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقہ میں حملہ آور مستقل حکومتیں قائم کرتے رہے اور یہاں پر ڈیرے ڈال کر نئے نئے تمدنوں اور نئے نئے معاشروں کی بنیادیں رکھتے رہے۔ قدیم زمانہ میں سب سے بڑی تمدنی لہر جو باہر سے آئی اُس کا عمل ۳۰۰۰ ق۔م سے لے کر تقریباً ۱۵۰۰ ق۔م تک یعنی قریباً ڈیڑھ ہزار برس تک جاری رہا۔ اُس کے بعد دوسری بڑی لہر ایرانیوں کے ساتھ ۵۱۸ ق۔م میں آئی۔

۵۱۸ ق۔م میں ایران میں ہخامنشی خاندان کا پہلا بڑا شہنشاہ دارا اوّل حکمران تھا جسے عصرِ حاضر کے ایرانی یونانیوں کی تقلید میں داریوش اور اس کی عظمت کی وجہ سے داریوش کبیر کہتے ہیں۔ داریوش کبیر کی

عظیم الشان سلطنت بیس صوبوں (SATRAPIES) پر مشتمل تھی۔ اور ان صوبوں میں سے ہر صوبہ بجائے خود گویا ایک ملک تھا۔ برصغیر ہند و پاکستان کا مفتوحہ علاقہ اس کی سلطنت کا بیسواں بڑا صوبہ (SATARAPY) تھا۔ اور داریوش کبیر کے کتبوں کے مطابق اس کے سب صوبوں سے زیادہ زرخیز اور ثروت مند صوبہ تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ اور جہلم کا درمیانی علاقہ بھی اس صوبے میں شامل تھا۔ ورنہ دریائے سندھ اور کوہ سلیمان کا درمیانی علاقہ تو کسی زمانے میں بھی بہت زرخیز نہیں رہا۔

اس تاریخی بات کا ثبوت کہ خطہ پوٹھوہار بھی ایران کے زیر نگیں تھا اس تاریخی واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان پر سکندر یونانی کے حملہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے مقابلہ میں شکست کھا جانے والے ایرانی شہنشاہ دارا گشتاسپ سوم کے تمام ممالک محروسہ کو جائز طور پر اپنی سلطنت خیال کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے شہنشاہِ ایران کو شکست دینے کے بعد وسط ایشیا اور ہندوستان کے اُن علاقوں پر یلغار کی جو دارا گشتاسپ کی سلطنت میں شامل تھے۔

ایرانیوں کے ساتھ میل جول کے نتائج

یوں تو برصغیر ہند و پاکستان میں بسنے والے اور اہل ایران کے درمیان باہمی میل جول ایک عرصہ دراز سے چلا آتا تھا اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وسط ایشیا سے ہجرت کرنے والے آریاؤں کی دو بڑی شاخیں ہو گئی تھیں جن سے ایک ہندوستان کی طرف آئی اور ہند آریائی شاخ (INDO ARYAN) کہلائی اور دوسری ایران اور عراق کے راستے یورپ تک پہنچی اور (INDO-EUROPEAN ARYAN) کہلائی۔ اس لئے نسلی اعتبار سے اہل ہند اور اہل ایران ایک دوسرے سے مختلف نہ تھے۔ لیکن صدیوں تک ایک دوسرے سے علیحدہ رہنے کی وجہ سے ان کی زبان اور طرزِ معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہو گئی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو آریائی قبائل ایران اور عراق میں آباد ہو گئے تھے وہ ذہنی اعتبار سے زیادہ آگے نکل گئے تھے۔ اُن کی طرزِ معاشرت زیادہ سلجھی ہوئی تھی اور اُن کا سیاسی اور سماجی شعور بھی زیادہ نکھر گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں ایک بہت مضبوط شہنشاہی حکومت قائم ہو گئی تھی اور اس کی حدود میں بڑے بڑے شہر آباد ہو گئے تھے۔ جبکہ ہندوستان میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں اور معیشت زیادہ تر دیہی تھی۔ آریاؤں کی آمد سے پہلے اس ملک کی معیشت اور معاشرت بہتر تھی اور انہوں نے بڑے بڑے شہر بھی آباد کئے تھے۔ جن کی طرزِ تعمیر سے اُن لوگوں کے سائنسی شعور کی بالیدگی کا پتہ چلتا ہے۔ آریاؤں کی آمد کے بعد چھوٹے

چھوٹے گاؤں معاشرتی زندگی کی اکائیاں بن گئے اور اِن اکائیوں میں پنچائتی طرز کے انتظامی ادارے قائم ہوئے۔ ان اداروں کے سربراہ عام طور پر مقامی پروہت ہُوا کرتے تھے جو مذہبی امور میں بھی لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

معاشرتی میدان کے علاوہ علمی میدان میں بھی اس برّصغیر کے لوگ اپنے ہم عصروں سے پیچھے رہ گئے۔ آریاؤں کی آمد سے پہلے یہاں کے لوگوں کی ایک زبان اور اُس زبان کا رسم الخط موجود تھا جس کے نمونے ہمیں موہنجوداڑو سے برآمد ہونے والی مختلف قسم کی مہروں سے ملتے ہیں لیکن آریاؤں نے مفتوحین کی زبان اور رسم الخط کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور جب اس زبان کے بولنے اور لکھنے والے اُن کے ہاتھوں مرکھپ گئے اور اُن میں سے بچ جانے والے جنوب کی طرف بھاگ گئے تو یہ زبان بالکل ختم ہو گئی اور کوئی نیا رسم الخط وجود میں نہ آیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج مصر اور عراق سے برآمد ہونے والے قدیم مخطوطوں کو تو پڑھ لیا گیا، لیکن وادیٔ سندھ سے برآمد ہونے والے مخطوطوں کو پڑھا نہیں جا سکا۔ اگر پرانا رسم الخط نابود نہ ہو جاتا اور اُس کے ریشے نئے رسم الخط میں منتقل ہوتے تو اُس قدیم رسم الخط کا پڑھنا ناممکن نہ ہوتا۔

آریاؤں کی اپنی زبان سنسکرت عرصۂ دراز سے وجود میں آ چکی تھی اور ویدوں اور دوسری مقدس اور متبرک نظموں کے اشلوک برہمنوں کے سینوں میں محفوظ تھے لیکن رسم الخط نہ ہونے کی وجہ سے یہ زبان ترقی نہ کر سکی تھی۔ ایرانیوں کے ہندوستان میں ورود کا ایک بہت بڑا فائدہ آریاؤں کو یہ ہُوا کہ انہوں نے ایرانیوں کے خروشتی رسم الخط کی بنیادوں پر اپنی زبان کے لئے ایک رسم الخط ایجاد کیا اور اس طرح سے وہ زبان جو پہلے صرف بولی جاتی تھی ضبطِ تحریر میں آ گئی اور وید، پران، کھٹ درشن رامائن اور مہابھارت جو آریاؤں کی مذہبی منظومات تھیں لوگوں کے حافظوں سے مختلف اشیاء مثلاً کیلے کے پتّوں، ہرن کی کھالوں اور کپڑے وغیرہ پر منتقل ہونا شروع ہوئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُسی زمانہ میں کاغذ بنانے کا فن بھی چین سے ہندوستان پہنچا اور باقاعدہ کتاب نویسی کا دور شروع ہُوا۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وید بہت پُرانے ہیں جب کہ رامائن اور مہابھارت آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے کی ہیں۔ لیکن آثار و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اِن میں سے کوئی بھی کتاب تین ہزار سال سے زیادہ پُرانی نہیں کیونکہ خود اس برّصغیر میں آریاؤں کی آمد کے عمل کی تکمیل آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے ہُوئی تھی اور ظاہر ہے کہ دیہی معاشرت سے ترقی کر کے بڑے بڑے شہروں کی تعمیر تک کا ارتقائی عمل کہیں صدیوں میں جا کر پُورا ہُوا ہوگا۔ رامائن اور مہابھارت دونوں اُس زمانہ کی کہانیاں ہیں جب دریائے سندھ اور گنگا کے میدان میں بڑے بڑے شہر آباد ہو چکے تھے اور اس حقیقت سے تو تاریخ کا ہر طالب علم بخوبی آشنا ہے کہ یہ زمانہ قبل مسیح سے ایک ہزار سال سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔

ایرانیوں کے رسم الخط سے جب آریاؤں نے ایک رسم الخط وضع کر لیا تو انہیں اس زبان کے اصول و قواعد بنانے

کا خیال بھی آیا۔ چنانچہ اس زبان کی ایک باقاعدہ گرامر ٹیکسلا کے رہنے والے ایک فاضل شخص نے جس کا نام پانینی تھا مرتب کی۔ پانینی کا زمانہ وہ ہے جب ٹیکسلا میں ایک بڑی درس گاہ قائم تھی اس لئے یہ زمانہ ظہورِ مسیح سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے کا ہے تواریخ کی بعض کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مہابھارت کی عظیم رزمیہ نظم کی تحریر اور تالیف بھی ٹیکسلا میں ہوئی تھی اور اسی زمانہ میں یہ پہلی بار ٹیکسلا کی مذہبی محافل یا غالباً راج دربار میں پڑھ کر سنائی گئی تھی۔

داریوش کبیر کے کتبات

۸۱۵ ق م میں جب داریوش کبیر نے موجودہ سرحد اور پوٹھوہار کا علاقہ فتح کیا تو اس نے اِس فتح کی خوشی میں کئی مقامات پر کتبات کندہ کرائے۔ ان کتبات میں داریوش کی طرف سے نہائت فخر کے ساتھ اِس امر کا اعلان کیا گیا تھا کہ جن علاقوں میں لوگ لاتعداد دیوی دیوتاؤں کی پرستش کیا کرتے تھے وہاں میں نے ایک خدا آہورمزدا کا مذہب جاری کیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ تفاخر بہت زیادہ خوش فہمی پر مبنی تھا کیونکہ اس سرزمین میں دیوی دیوتاؤں کی پوجا بدستور جاری رہی اور سکندر یونانی کی آمد کے وقت بھی یہ لوگ اسی طرح دیوی دیوتاؤں کی پرستش میں مشغول تھے اور ان کے ہاں ایک خدا کا تصور ناپید تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ایرانی اس علاقہ میں سامراجیوں کی حیثیت سے آئے تھے اور ان کا مقصدِ وحید اپنی سلطنت کی حدود کی توسیع اور اپنے مال و دولت میں اضافہ تھا وہ کوئی دینی یا تبلیغی مقصد لے کر نہ آئے تھے۔ نہ ہی ان کے پاس کوئی ایسا ترقی یافتہ دین تھا جسے وہ مفتوح اقوام کے سامنے احساسِ برتری کے ساتھ پیش کرتے۔ لہٰذا وہ اس خطہ کے لوگوں کو کسی طرح بھی متاثر نہ کر سکے صرف ایک ہی چیز ان کے پاس یہاں کے لوگوں سے زیادہ تھی اور وہ تھا رسم الخط۔ انہوں نے یعنی برِصغیر ہند و پاکستان کے رہنے والوں نے ان کے رسم الخط سے فائدہ اٹھا کر اپنا ایک رسم الخط بنا لیا۔ اور زندگی کا صرف ایک یہی شعبہ تھا جس میں وہ ایرانیوں سے متاثر ہوئے۔ اس میل جول کا ایک اور قابلِ ذکر نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جاٹ میں شامل ہو کر ایران اور عراق سے بھی گزر کر یونان تک جا پہنچے اور مختلف معرکوں میں شریک ہونے لگے اس طرح یورپ اور برِصغیر ہند و پاکستان کے درمیان پہلی بار رابطہ قائم ہوا۔

ظہورِ اسلام کے بعد

ظہورِ اسلام کے فوراً بعد مسلمانوں نے سیستان اور مکران کے راستے دیبل پر حملہ کیا تھا اور ان کی افواج نے ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ محمد بن قاسم کے واپس چلے جانے اور خلافت امویہ کے بے توجہ ہو جانے کی وجہ سے عربوں کی حکومت رفتہ رفتہ کمزور ہوتی چلی گئی اور ڈیڑھ دو سو سال کے بعد تک تو عربوں کے حملہ کے اثرات بالکل ہی ختم ہو گئے۔

بعض تواریخ میں آیا ہے کہ راجہ داہر کا بیٹا راجہ جے سنگھ ملتان سے بھاگ کر کشمیر کی طرف چلا آیا تھا اور اُس کے ساتھ ایک عرب سردار حمیم بن سامہ بھی تھا کشمیر کے مہاراجہ نے جے سنگھ کی بڑی آؤ بھگت کی اور اُسے دو سو گھوڑے معہ ساز و سامان کے اور گذارہ کے لئے ایک معقول جاگیر بھی دی، جے سنگھ نے اپنی بقیہ زندگی اسی جاگیر میں بڑے آرام اور اطمینان سے گذاری اور حمیم بن سامہ زندگی بھر اُس کا ساتھی اور مددگار رہا۔ جے سنگھ کے مرنے کے بعد حمیم بن سامہ خود اس جاگیر پر قابض ہو گیا۔

جنرل کننگھم کے قول کے مطابق راجہ جے سنگھ کو جو جاگیر دی گئی تھی وہ کشمیر کی وادی میں نہ تھی بلکہ کوہستانی نمک کے علاقہ میں تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں اغلباً کشمیر کی سلطنت کی حدود پوٹھوہار کو بھی احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ حمیم بن سامہ پہلا مسلمان تھا جو اِس علاقہ میں آیا اور اُس نے اس علاقہ میں دین کی تبلیغ بھی کی تاہم یہ روایات جو تواریخ کی بعض کتابوں میں آگئی ہیں کچھ ایسی مستند نہیں کہ انہیں بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جائے۔

ظہورِ اسلام کے بعد مسلمانوں کی جو پہلی بڑی تہذیبی لہر پوٹھوہار میں وارد ہوئی وہ سلطان محمود غزنوی اور اُس کی افواج کی صورت میں نمودار ہوئی تھی، اگرچہ سلطان کی افواج میں عرب نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے لیکن اُن کی تعداد بہت کم تھی اور یہ عربی النسل لوگ بھی چونکہ پشت ہا پشت سے ایران اور توران میں مقیم تھے اس لئے اُن کی تکلّمی اور علمی زبان فارسی تھی۔ سلطان کی آمد سے پہلے بھی برّصغیر کے بعض علاقوں میں مسلمان پہنچ چکے تھے اور ملتان میں تو انہوں نے اپنی باقاعدہ حکومت بھی قائم کر لی تھی لیکن اُن کی موجودگی اور حکومت کے کچھ ایسے اثرات اس برِّصغیر کے لوگوں پر مرتّب نہ ہو سکے جنہیں قابلِ لحاظ کہا جا سکے۔

سلطان کی افواج کے ساتھ البتّہ بہت سے ایسے مسلمان آئے تھے جو جہاد کے ساتھ ساتھ تبلیغِ دین کا اہم فریضہ بھی ادا کرتے تھے۔ ان میں نمایاں ترین سلطان کے ایک معزّز فوجی سردار عطاء اللہ غازی اور اُن کے بیٹے سالار قطب شاہ اور سالار ساہو تھے۔ یہ لوگ سلطان کے قریبی عزیز بھی تھے کیونکہ سلطان کی ہمشیر جن کا نام تو تاریخوں میں بالتصریح نہیں آیا لیکن جن کا لقب ستر معلّیٰ تھا سالار ساہو کے عقد میں تھیں۔ انہی کے فرزند ارجمند سالار مسعود غازیؒ تھے جو تاریخ میں سلطان الشہداء اور شہیدِ اوّل کے القابات سے یاد کئے جاتے ہیں۔ سالار مسعود غازی کا تولد پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں اجمیر کے مقام پر ہوا تھا اور انہوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال وہیں گذارے تھے۔ اُس کے بعد وہ اپنی والدہ کے ہمراہ کشمیر کی طرف آئے تھے جہاں اُن کے والد سالار ساہوؒ "کابلیر" کے قلعہ کے حاکم تھے۔ اُس کے بعد تک کے اُن کے سفر کا حال تاریخ مسعودی میں تفصیل سے دیا گیا ہے۔ اس سفر کے دوران وہ دو دن کے لئے راول کے مقام پر بھی ٹھہرے یہ وہی مقام ہے جو اب اسلام آباد کے تقریباً وسط میں ہے اور یہاں نالہ کورنگ پر بند باندھ کر راول جھیل

بنائی گئی ہے اُس زمانہ میں راول کے مقام پر ایک بڑا ہندو زمیندار جس کا نام ستوگن تھا اس علاقہ کا راجہ تھا، اگرچہ اُس کی ریاست برائے نام ہی تھی لیکن غزنی کے دربار میں اُسے اثر و رسوخ حاصل تھا کیونکہ اُس کی بیٹی سُلطان محمود غزنوی کے وزیر خواجہ حسن مہندی کے بیٹے کے حرم میں تھی۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ خواجہ حسن میمندی کی سالار عطاء اللہ غازی کے ساتھ حریفانہ چشمک تھی اور وہ اُن کی اولاد کا دشمن تھا، چنانچہ سالار مسعود غازی رحمتہ اللہ علیہ کے اس سفر کے دوران ستوگن کی کوشش رہی کہ اُنہیں گزند پہنچائے۔ حتیٰ کہ اس نے جو مٹھائی اُن کی خدمت میں بھجوائی اُس میں زہر ملا تھا۔ لیکن سالار موصوف اُس کی شر انگیزیوں کے باوجود بالکل محفوظ رہے۔

سالار مسعود غازیؒ بڑے ذہین و فطین انسان تھے۔ اُنہوں نے بہت چھوٹی عمر میں علوم دین پر عبور حاصل کر لیا تھا اور اُس کے بعد وہ اجمیر، دہلی اور یو۔پی کے علاقوں میں ہندوؤں کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔ اپنی مہمات کے دوران اُنہوں نے دہلی کے راجہ ماہی پال کو شکست دے کر وہاں بھی اسلامی علم لہرایا۔ لیکن دہلی پر اُن کا قبضہ کوئی چھ مہینے ہی رہا، چونکہ اُنہیں اپنے ساتھیوں سمیت جانا تھا اس لئے دہلی کی فتح دُور رس نتائج پیدا نہ کر سکی البتہ اس سے ایک تاریخی حقیقت جو عام طور پر آنکھوں سے اوجھل ہے ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ دہلی مسلمانوں کے ہاتھوں پہلی بار بارہویں صدی کے آخر میں فتح نہیں ہوئی بلکہ گیارہویں صدی کے اوائل میں ہو چکی تھی دہلی سے نکل کر سالار موصوف راجپوت راجاؤں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے بہرائچ کے مقام تک جا پہنچے، چونکہ اُن کے ساتھیوں کی تعداد بہت قلیل تھی اور قریب سے کہیں کمک بھی نہ پہنچ سکتی تھی اس لئے ہندو راجاؤں نے غلبہ کیا اور وہ دشمنوں کی بہت بڑی کثرت سے جنگ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سمیت شہید ہوئے شہادت کے وقت اُن کی عمر صرف اُنیس برس کی تھی اُن کا مزار آج تک بہرائچ کے مقام پر زیارت گہ خاص و عام ہے اور نہ صرف مسلمان بلکہ ہزارہا ہندو بھی نہایت عقیدت کے ساتھ اُن کے مزار پر سلامی کے لئے حاضری دیتے منتیں مانتے اور مرادیں حاصل کرتے ہیں۔

سالار مسعود غازیؒ کے چچا سالار قطب شاہ نے جو برصغیر ہند و پاکستان میں ساداتِ علوی جو اعوان کہلاتے ہیں کے جد امجد بھی تھے۔ سلطان محمود غزنوی سے اجازت لے کر اپنے کچھ ساتھیوں سمیت پوٹھوہار ہی کے علاقہ میں ڈیرے ڈال دیئے اور یہاں تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کیا۔ اُنہوں نے سون سکیسر کے علاقہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اور یہیں سے تبلیغ دین کی ابتداء کی۔ اردگرد کے علاقہ میں حکومت کرنے والے راجے راجپوت ہندو تھے جو اُن کی سرگرمیوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ کئی ایک راجاؤں کے ساتھ اُن کی لڑائیاں بھی ہوئیں، ان راجاؤں میں سے چند ایک نے اسلام قبول کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی رعایا کے ہزاروں افراد بھی

اسلام کی آغوشِ شفقت میں آ گئے ان نومسلم راجاؤں میں سے ایک راجہ دھن کوٹ کا بھی تھا دھن کوٹ ایک قلعہ تھا جو دریائے سندھ کے کنارے واقع تھا قیاس غالب یہ ہے کہ یہی وہ مقام تھا جہاں آج کل کالا باغ کا چھوٹا سا شہر آباد ہے راجہ کے قبولِ اسلام کے بعد دھن کوٹ کا نام دین کوٹ رکھا گیا۔

فارسی زبان کے اثرات

مسلمانوں کی آمد سے پہلے پوٹھوہار کے علاقہ میں جو زبان مروّج تھی وہ ایک قسم کی پراکرت تھی جو سنسکرت کے تنے سے پھوٹی تھی - اس زبان میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ بھی شامل تھے - چنانچہ آجکل بھی سنسکرت کے بے شمار ایسے الفاظ ہیں جو براہِ راست اس زبان میں آئے ہیں الفاظ کے علاوہ پوٹھوہار کے لوگوں کا اب و لہجہ بھی برصغیر کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں سنسکرت کے لب و لہجہ سے زیادہ قریب ہے - چنانچہ کچھ ایسی آوازیں جو سنسکرت زبان کے ساتھ مخصوص ہیں پوٹھوہاری زبان میں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن جب مسلمان اس علاقے میں وارد ہوئے اور مقامی زبان پر فارسی زبان کا عمل دخل شروع ہوا تو فارسی زبان کے بہت سے الفاظ بھی اس زبان میں شامل ہو گئے اور ان الفاظ کے ذریعے مقامی اور ایرانی لوگوں کے لئے ایک دوسرے کی بات چیت سمجھنا آسان ہو گیا اور ہر چند کہ یہاں کے باشندے فارسی زبان نہ بول سکتے تھے لیکن سمجھ لیتے تھے - اسی طرح ایرانی لوگ مقامی زبان بول تو نہ سکتے تھے لیکن یہاں کے لوگوں کا مفہوم سمجھ لیتے تھے -

جب ہم پوٹھوہاری زبان کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بیسیوں ایسے الفاظ ملتے ہیں جو بالکل اپنی ابتدائی صورت میں ہیں اور ان کا مفہوم بھی بعینہٖ وہی ہے جو فارسی زبان میں ہے - مثلاً، پارسال اُردو میں بھی گذرے ہوئے سال کے لئے بولا جاتا ہے لیکن پرارسال جو فارسی میں گذشتہ سے ایک سال پہلے کے لئے بولا جاتا ہے پوٹھوہاری زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں نہیں بولا جاتا - فارسی زبان میں لفظ قاشق ترکی زبان سے آیا ہے اور یہی لفظ بعینہٖ پوٹھوہاری زبان میں بھی بولا جاتا ہے حالانکہ پوٹھوہار سے آگے پنجاب میں اسے چمچ اور اُردو میں چمچہ کہا جاتا ہے اُردو میں فارسی کے دہ کے لئے دس اور پنج کے لئے پانچ آتا ہے لیکن پوٹھوہاری زبان میں پنج اور دہ ہی مستعمل ہے - فارسی کا پنجاہ البتہ پنجابی اور پوٹھوہاری زبان دونوں میں موجود ہے جبکہ اُردو میں اسکے لئے لفظ پچاس آتا ہے -

فارسی بطور مذہبی زبان

فارسی زبان کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ زبان خطۂ پوٹھوہار کے لئے مذہبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور مبلّغین نے

اِس زبان کے توسط سے اِس علاقہ میں دینِ اسلام کی تبلیغ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مذہبی اصطلاحات جو یہاں رائج ہیں وہ عربی زبان کی بجائے فارسی زبان سے آئی ہیں مثلاً خُدا، پیغمبر، نماز روزہ، فرشتے وغیرہ۔ اس قسم کی اصطلاحات تو اُردو میں بھی رائج ہیں لیکن کئی اصطلاحات ایسی ہیں جو اُردو میں تو عربی زبان سے آئی ہیں لیکن اُن کی مترادف اصطلاحات پوٹھوہاری زبان میں فارسی زبان کے مطابق فجر، پیشی (پیشینی) دیگر، نماشاں (شام) اور خُفتاں (خُفتن) ہیں۔

اہلِ ایران نے مذہب کو عوام کے لئے آسانی سے قابلِ فہم بنانے کی غرض سے ابتدائی مذہبی تعلیمات کو آسان فارسی نظم کے قالب میں ڈھال لیا تھا اور یہی منظومات مکتبوں میں بچوّں کو پڑھائی جاتی تھیں چنانچہ وہ نظم کے دلچسپ پیرایہ میں دین کے ابتدائی احکام سے پوری پوری واقفیّت حاصل کر لیا کرتے تھے۔ فارسی کی یہی آسان، عام فہم، دلچسپ اور فوراً ذہن نشین ہونے والی منظوم کتابیں پوٹھوہار کے علاقہ میں بھی رائج تھیں۔ چنانچہ مکتب میں سب سے پہلے بچّہ کو پندنامہ سعدیؒ المعروف کریما پڑھایا جاتا تھا اور اُس کے بعد اُسے "نام حق" اور پھر پندنامہ شیخ عطار پڑھایا جاتا تھا۔ اِن کتابوں میں نمازوں کے اوقات، وضو کرنے کے طریقے، روزہ رکھنے کے آداب، ذاتی صفائی اور پاکیزگی اور دوسرے بنیادی دینی احکام ہُوا کرتے تھے جن کے پڑھنے سے بچّہ مذہب کے موٹے موٹے اصولوں اور دین کے عمومی احکام سے واقف ہو جایا کرتا تھا۔ پوٹھوہار کے طلبہ کے لئے اس کا ایک اور بڑا فائدہ یہ تھا کہ اُنہیں بچپن ہی سے فارسی زبان کا ادراک ہو جاتا تھا جو آئندہ تعلیم میں اُن کے لئے ممد و معاون ہوتا کیونکہ مذہبی تعلیم کی بہت سی نصابی اور غیر نصابی کتابیں فارسی میں تھیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پنجابی زبان میں اسی طرح کی مفید منظوم کتابیں تو بہت ہیں جو مسجدوں میں درجہ بدرجہ پڑھائی جاتی ہیں لیکن ہماری قومی زبان اُردو میں اِن کی بے حد کمی ہے اور ہماری دُوسری قومی زبان یعنی بنگلہ میں تو اِن کی تعداد اور بھی کم ہے۔

تدریسی نظام

ابتدائی تعلیم کے بعد بھی تعلیم کا نصاب کچھ اس طریقہ سے تیار کیا گیا تھا کہ لوگ چند سال کی تعلیم کے بعد فارسی زبان پر حاوی ہو جاتے تھے چنانچہ پندنامہ شیخ عطار کے بعد درسی کتابوں کا سلسلہ گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، اسکندر نامہ سے ہوتا ہُوا شاہنامہ فردوسی تک پہنچتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مکتبوں میں صرف فارسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی اور عربی زبان کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ بلکہ فی الواقع ابتداہی سے عربی زبان کی طرف بھی توجہ دی جاتی تھی چنانچہ جب بچّہ چار سال اور چار مہینے کا ہو جاتا تھا تو اُسے عربی ابجد پڑھایا جاتا تھا۔ اس کے بعد اعراب اور پھر دو حرفی اور سہ حرفی مرکبات میں اعراب کے استعمال سے واقف کیا جاتا تھا۔ ازاں بعد اُسے قرآن کریم کا پہلا پارہ پڑھایا جاتا تھا۔ قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کے ساتھ

ہی ساتھ بچے مختلف دعائیں اور چھوٹی چھوٹی قرآنی سورتیں حفظ کر لیا کرتے تھے عام طور پہ تین ساڑھے تین سال کے تعلیمی عرصہ میں بچے قرآن مجید ناظرہ مکمل کر لیتے تھے اور انہیں بہت سی دعائیں اور سورتیں زبانی بھی یاد ہو جایا کرتی تھیں۔ اس عرصہ میں فارسی زبان میں وہ کریما، نامِ حق، پند نامہ شیخ عطار اور گلستانِ سعدی بھی پڑھ لیتے تھے گویا آٹھ نو سال کی عمر تک بچہ تمام ابتدائی مذہبی تعلیم پر عبور حاصل کر لیتا تھا اس کے بعد جو بچے مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے وہ قرآن مجید بامعنی، تفسیر قرآن، دورۂ حدیث اور علم فقہ کے مراحل طے کرتے تھے اور فارسی میں بوستان، سکندر نامہ، یوسف زلیخا، شاہنامہ فردوسی اور مثنوی مولانا روم پڑھتے تھے اس طرح انہیں عام طور پر فارسی اور عربی ہر دو زبانوں میں معقول استعداد حاصل ہو جاتی تھی۔

اس نظام تدریس کا نتیجہ یہ تھا کہ پوٹھوہار کے علاقہ میں اسّی فیصد سے زیادہ لوگ پڑھے لکھے تھے اور اپنی علمی استعداد کی بنا پر اپنے روزمرہ کے کام بطریق احسن سرانجام دے سکتے تھے۔ پڑھے لکھے افراد میں عورتوں کا تناسب مردوں کے تقریباً مساوی ہوتا تھا۔ کیونکہ محلوں کی مساجد میں جہاں مکتب قائم تھے چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو اکٹھے تعلیم دی جاتی تھی۔

جب لڑکیاں اور لڑکے گیارہ بارہ برس کی عمر کو پہنچ جاتے تھے تو وہ اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کر کے مشاغل زندگی میں مصروف ہو جاتے تھے۔ لڑکے کھیتوں میں اپنے باپوں کا ہاتھ بٹانے لگتے اور لڑکیاں گھر میں چرخہ کاتنے اور سلائی کڑھائی کے کاموں میں لگ جاتی تھیں اور یوں زندگی کا سلسلہ آگے چلتا رہتا تھا۔ البتہ ہر جگہ کچھ ایسے نوجوان بھی ہوتے تھے جو تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کرنا چاہتے تھے اور تحصیل علم کے بعد خود اپنی زندگی درس و تدریس کے کام میں گزارنا چاہتے تھے۔ ایسے طلباء بڑے بڑے شہروں میں نکل جاتے جہاں تعلیم کی اعلیٰ درسگاہیں ہوتی تھیں اور وہ اپنے گھروں اور اپنے اعزہ و اقارب سے جدا ہو کر کئی کئی سال تک ان میں تعلیم حاصل کرتے رہتے۔ ان درسگاہوں میں چونکہ تدریس ہی مفت نہ ہوتی تھی بلکہ طلباء کی بود و باش، خوراک، لباس اور تمام دوسری ضروریات بھی درسگاہوں کے ذمہ ہوتی تھیں لہٰذا طلباء بے غل و غش اپنی تعلیم مکمل کر لیتے تھے

تہذیب اخلاق

تدریس کے اس نصاب سے جہاں ہر شخص انفرادی طور پر اعلیٰ اخلاقی صفات سے متصف ہوتا تھا وہاں اجتماعی طور پر بھی قوم تہذیب و تمدن کی اعلیٰ اقدار سے بہرہ ور ہوتی تھی۔ یہ امر ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اخلاقی تعلیم کا جتنا مواد فارسی ادب میں ہے اُتنا شاید تمام دنیا کی زبانوں کے ادب میں مجموعی طور پر بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اقوام جن میں صدہا سال تک تعلیم و تدریس فارسی زبان میں ہوتی رہی اخلاقی اعتبار سے دنیا کی دوسری اقوام سے بلند و برتر رہیں

اور ان کی یہ برتری نہ صرف اُس زمانہ میں قائم رہی جب وہ سیاسی طور پر غالب و برتر تھیں بلکہ اُس زمانہ میں بھی قائم رہی جب وہ سیاسی میدان میں زوال پذیر ہو چکی۔ زمانہ بعید میں اس کی ایک مثال وہ دور ہے جب منگولوں کے استیلا نے مسلمانوں کی سیاسی قوت کے قلعہ کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے اندر وہ اُن کی اخلاقی قوت سے مغلوب ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور ایک بار پھر اُن کے توسط سے اسلامی حکومتوں کو دوبارہ شوکت و عظمت نصیب ہوئی۔ زمانۂ قریب میں برّصغیر ہندو پاکستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ سیاسی زوال کے باوجود اُن کی اخلاقی قوت بدستور قائم رہی اور اسی اخلاقی قوت نے ایک بار پھر اُنہیں آزادی کی نعمت عطا کی۔ اس اخلاقی نشوونما میں ہمارے نظامِ تعلیم اور نصاب تدریس نے جتنا اہم کام کیا ہے وہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر ہم کسی آئندہ موقعہ پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

بقیہ: شذرات

ہو رہی ہیں لیکن اب تک دونوں نظام ہائے تعلیم میں بُعد اور مغائرت موجود ہے۔

ہمارے صوبائی محکمہ اوقاف نے پہلے ہی دن سے قدیم نظامِ تعلیم، اُن سے متعلق حضرات اساتذہ اور علما نیز ائمہ و خطبا کو آج کے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے منصب پر فائز کرانے کا مقصد اپنے سامنے رکھا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ائمہ و خطبا اکیڈمی قائم کی گئی۔ پھر بہاول پور میں ایک باقاعدہ جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ پچھلے دنوں لاہور کی تاریخی مسجد عالمگیری میں علما اکیڈمی کی بنیاد رکھی گئی۔ ان دنوں محکمہ اوقاف علمائے کرام اور دوسرے اربابِ علم و دانش کے مشورے سے ایک ایسا نظامِ تعلیم مرتب کرنے کی کوشش میں ہے جسے ہمارے عربی و دینی دار العلوم بتدریج اپنا سکیں۔

یہ بڑا اہم کام ہے۔ خدا کرے محکمہ اوقاف کے اربابِ حل و عقد اسے اتمام کو پہنچانے میں کامیاب ہوں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی واضح ہونی چاہیئے کہ تمام مسلمان ملکوں میں پرانے نظامِ تعلیم میں ضروری تبدیلیاں وہاں کے محکمہ ہائے اوقاف ہی کے زیرِ اہتمام ہوئی ہیں، خود دار العلوموں نے اپنے ہاں تبدیلیاں نہیں کیں۔ دوسرے ان ملکوں میں یہ نظامِ تعلیم اور اس سے متعلقہ ادارے بالواسطہ یا بلا واسطہ محکمہ اوقاف کے تحت ہیں۔ گویا ایک مسلمان ملک کی مذہبی زندگی کی تمام سرگرمیوں کی نگرانی وہاں کے محکمہ اوقاف کے ذمے ہوتی ہے۔